اختر حسین جعفری

اَور کسے ہے دُھوپ کے دُکھ پر فکر کی عادت
بادل سے باتیں کرنے کا کِس کو ایسا ڈھب آتا ہے
دُھوپ سخن ہے
ابر کہانی
اور یہ آج کی شام سہانی
شاخِ آئندہ کے پھول پہ سبز دعائیں
نادیدہ افلاک کے تارے، لفظ تمھارے
کِس کِس ہاتھ نے تم پر وارے
شرق و غرب کے چڑھتے دن سے ڈھلتی شام سے قاصد لائے
بڑھتی عُمروں کی خوش خبری
دائم حرفوں کا سندیسا
گردن اونچی رکھ درویشا
بادل سے باتیں کرنے کا کس کو ایسا ڈھب آتا ہے

پروین شاکر

سرِ شاخِ گل

وہ سایہ دار شجر
جو مجھ سے دور، بہت دور ہے، مگر اس کی،
لطیف چھاؤں،
سجل، نرم چاندنی کی طرح،
مرے وجود، مری شخصیت پہ چھائی ہے!
وہ ماں کی باہنوں کی مانند، مہرباں شاخیں،
جو ہر عذاب میں مجھ کو سمیٹ لیتی ہیں
وہ ایک مشفقِ دیرینہ کی دعا کی طرح،
شریر جھونکوں سے پتّوں کی نرم سرگوشی
کلام کرنے کا لہجہ مجھے سکھاتی ہے!
وہ دوستوں کی حسین مسکراہٹوں کی طرح
شفق عذار، دھنک پیرہن، شگوفے، جو
مجھے زمیں سے محبت کا درس دیتے ہیں!

اُداسیوں کی کسی جاں گداز ساعت میں،
میں اس کی شاخ پہ سر رکھ کے روئی ہوں جب بھی
تو میری پلکوں نے محسوس کرلیا فوراً
بہت ہی نرم سی اک پنکھڑی کا شیریں لمس!
(نمی تھی آنکھوں میں، لیکن میں مُسکرائی ہوں!)
کڑی ہو دھوپ،
تو پھر برگ برگ ہے شبنم
تپاں ہوں لہجے،
تو پھر پھول پھول ہے ریشم
ہرے ہوں زخم
تو سب کونپلوں کا رس مرہم
جو فرقتیں ہوں
تو پھر شاخ شاخ ہے سنگم!
وہ ایک جھونکا،
جو اُس شہرِ گُل سے آیا ہے،
اب اس کے ساتھ بہت دور جا چکی ہوں مَیں،
مَیں ایک ننھّی سی بچّی ہوں، اور خموشی سے،
بس اس کی اُنگلیاں تھامے، اور آنکھیں بند کیے،
جہاں جہاں لیے جاتا ہے، جا رہی ہوں مَیں!

وہ ایک خوشبو ،
جو میرے وجود کے اندر ،
صداقتوں کی طرح زینہ زینہ اُتری ہے ،
کرن کرن ، مری سوچوں میں جگمگاتی ہے ،
(مجھے قبول کہ وجداں نہیں یہ چاند مرا ،
یہ روشنی مجھے ادراک دے رہی ہے مگر!)

وہ سایہ دار شجر
جو دن میں میرے لیے ماں کا نرم آنچل ہے ،
وہ رات میں ، مرے آنگن پہ ٹھیرنے والا ،
شفیق ، نرم زباں ، مہربان بادل ہے !

مرے دریچوں میں جب چاندنی نہیں آتی
جو بے چراغ کوئی شب اُترنے لگتی ہے ،
تو میری آنکھیں ، کرن کے شجر کو سوچتی ہیں ،
دبیز پردے نگاہوں سے ہٹنے لگتے ہیں ،
ہزار چاند ، سرِشاخِ گُل اُبھرتے ہیں !

پشتو: ایوب صابر
اردو: جلیل حشمی

تائید

سب کے شاعر
اے انسان کے نغمہ گر
تجھے سلام
اے انسان کے نغمہ گر
رنگ اور نسل کے عالم سے تو بالا ہے
تو لاہور اور سرگودھا کا نہیں ندیم
تو ساری دنیا کا رہنے والا ہے

پاک وطن سے پھیلی ہیں تیری خوشبوئیں تیرے رنگ
تو انسان کے ساتھ ہے ۔ ساری انسانیت تیرے سنگ

رچنا میں ' مہران میں تو
خیبر اور بولان میں تو
تورخم اور بدین میں تو
اے انسانیت کے گلشن کی خوشبو اور رنگ کے شاعر
اپنے پاک وطن کے نام و ننگ کے شاعر
اے انسان کے شاعر
اے لاہور کے اور میرے باگرام[1] کے شاعر
اے انسان کے نغمہ گر اے سب کے شاعر
میری جان !
عظیم انسان
اے صابر ایسے اس دور کے دوزخ میں جلنے والوں کے نغمہ گر
ہے مجھے خبر
اس دوزخ میں تو بھی تو جلا ہے
جیسے ہم سرحد والے اپنے مہمان کی خاطر
دُنبے کو اس کی چربی میں بھونتے ہیں

[1] باگرام : پشاور کا قدیم نام

اے میرے غیور ندیم
اے پاک وطن پر مرنے والے ! تو نے کہا ہے :
"تو نے اِس دور کے دوزخ میں جلایا ہے مجھے
اے خدا ' اب ترے فردوس پہ میرا حق ہے"
میں کرتا ہوں تائید اس کی
اے میرے غیور ' اے میرے جسور ندیم !
جا بختاور ' جا جنت کا دروا ہے تیرے لئے !

محسن نقوی

ندیم

ہر درد پہ مسکرا رہا ہے
انساں ہے وہ کہ دیوتا ہے

وہ اہلِ سفر کا حوصلہ ہے
آندھی میں دیئے جلا رہا ہے

جب گنبدِ شب سکوت پہنے
وہ اپنی غزل میں گونجتا ہے

برگد کی طرح ، مسافروں کو
وہ دھوپ میں چھاؤں بانٹتا ہے

دشمن کو گلے لگا کے ملنا
اب اس کا مزاج بن گیا ہے

ہر دَور اُسی کی دسترس میں
ہر دَور اُسی کا ہمنوا ہے

شامل ہے ہجومِ دوستاں میں
لیکن وہ الگ سے بولتا ہے

لمحوں میں وہ کب سمٹ سکے گا
صدیوں پہ محیط ہو چلا ہے

قتیل شفائی

ندیم ایک چاند ہے

کوئی ہے نام کے لئے ، کوئی نسب کے واسطے
ندیم کی ہیں نکہتیں ، چمن میں سب کے واسطے
وہ جل رہا ہے آج تک زوالِ شب کے واسطے
وہ روشنی کا ہے خدا ، وہ صبح کا رسول ہے
ندیم ایک چاند ہے ، ندیم ایک پھول ہے

مٹے مٹے ہیں راستے ، قدم قدم پہ دُھول ہے
کہیں کوئی چٹان ہے ، کہیں کوئی ببُول ہے
وہ تھک کے بیٹھ جائے گا ، یہ راستوں کی بھول ہے
نہ وہ کبھی اُداس تھا ، نہ وہ کبھی ملول ہے
ندیم ایک چاند ہے ، ندیم ایک پھول ہے

چلا نہ دو قدم کبھی وہ مصلحت کی راہ پر
نظر نہ اُس کی جم سکی ، کسی بھی کج کلاہ پر
وہ خندہ زن رہا سدا ہر اک جہاں پناہ پر
اس ایک جرم پر اُسے ہر اک سزا قبول ہے
ندیم ایک چاند ہے ، ندیم ایک پھول ہے

کٹھن تھے راہِ شوق میں اگرچہ لاکھ مرحلے
تراشیں اس نے منزلیں ، بنائے اس نے قافلے
نہ سو سکا وہ شب گئے نہ رُک سکا وہ دن ڈھلے
مسلسل ایک جستجو ، ندیم کا اُصول ہے
ندیم ایک چاند ہے ، ندیم ایک پھول ہے

احمد فراز

ندیم آنکھیں، ندیم چہرہ

ندیم چپ تھا
مگر سدا کی شفیق آنکھوں پہ
دُکھ کی کائی جمی ہوئی تھی
سدا کے اس مہربان چہرے کا زخم
جو کب کا بھر چکا تھا
وہ پھر ہرا ہو کے کنجِ لب سے دل و جگر تک پہنچ چکا تھا
ندیم چپ تھا
مجھے تو ایسا لگا کہ جیسے

کسی نے اس کے نحیف شانوں سے
اس کے زندہ وجیہہ سر کو ہٹا کے
"زوبی" کا ساختہ چہرۂ سفالیں
لگا دیا ہے
یہ کرب، ضبطِ الم کی حد تھی
بہت سے احباب جمع تھے
جب میں دل گرفتہ
عدالتِ عالیہ کے ایواں سے
باہر آیا
اِدھر اُدھر لوگ حال احوال پوچھنے کے لئے
کھڑے تھے
تو کشور و کامراں کی آنکھوں میں سسکیاں
اور گلے میں آنسو اٹک گئے تھے
یہ وہ گھڑی تھی
کہ میرے اندر کے حوصلوں کی
سبھی چٹانیں تڑخ رہی تھیں
وہ زلزلہ سا وجود میں تھا
کہ میری بنیاد ہل رہی تھی

گناہ میرے قلم کا سچ تھا
اور اس کی پاداش میرے یاروں کو
میرے پیاروں کو مل رہی تھی
یہ ساعتِ جانستاں کڑی تھی
اور اس سے پہلے کہ سچ کا پندار
واہموں سے شکست کھاتا
ندیم کی مہربان آنکھیں
ندیم کے دل نواز لب مجھ سے کہہ رہے تھے
"فراز! ہم تم تو وہ ہیں
جن کے نصیب میں زندگی کی ساری اذیتیں ہیں
کہ جس مسافت پہ ہم چلے ہیں
وہ حرفِ حق کی مجاہدت ہے
ہمیں نہ جاہ و حشم، نہ مال و منال کی آرزو رہی ہے
نہ ہم کو طبل و عَلم، جمال و جلال کی جستجو رہی ہے
بس اک قلم ہے کہ جس کا ناموس
ہم فقیروں کا کُل اثاثہ ہے، آبرو ہے
بس ایک سچ ہے
کہ جس کی حرمت کی آگہی سے

مِرے بدن میں، ترے قلم میں
وہی لہو ہے
کہ جس سے انسان کی نمُو ہے
ابھی سے تم ڈولنے لگے ہو!
ابھی سے سُکھ کے مقابلے میں صعوبتیں تولنے لگے ہو؟
مجھے بھی دیکھو
کہ جس کے چہرے پہ زخم اب نقش بن گئے ہیں
کہ جس کے پیراھنِ دل و جاں پہ
ساٹھ پیوند لگ چکے ہیں
تمام پیوند زندگی کی ودیعتیں ہیں
مگر مجھے مضمحل بھی دیکھا؟
کبھی مجھے منفعل بھی دیکھا؟
میں اب بھی دشتِ وفا میں گرمِ سفر ہوں، گرمِ سفر رہا ہوں
کہ میں سمجھتا ہوں
یہ وہ صحرائے درد ہے، جس میں
تشنگی ہے، گرسنگی ہے، برھنگی ہے
یہاں ملامت کے سنگ، طعنوں کے تیر
شرمندگی کے خنجر برس رہے ہیں

یہاں تو ہر راھرو کی گردن میں طوق ' پاؤں میں بیڑیاں ہیں
یہاں تو زنداں کی ظلمتیں اور قتل گاہوں کی لالیاں ہیں
مگر کبھی میں رُکا نہیں ہوں! مگر کبھی میں جھکا نہیں ہوں!
یہی تو دشتِ وفا ہے ' جس میں
تمہارے جسموں ' ہمارے جسموں
کے ہر طرف استخواں پڑے ہیں
یہی تو وہ راستے ہیں جن میں
مسیحؑ بن کر ' حسینؑ بن کر
صداقتوں کے امیں لڑے ہیں
فقط ہمیں تو نہیں اکیلے
یہاں بہت سے عَلَم گڑے ہیں
انہیں کے ایثار سے ہی جانبر صداقتیں ہیں
انہیں کے افکار ہی سے
ہم اہلِ دل کی باہم رفاقتیں ہیں
تمہارے بازو ابھی توانا ہیں
جسم میں خون کھولتا ہے
قلم سے عہدِ وفا کیا ہے

قلم تو پھر سچ ہی بولتا ہے
اٹھاؤ آنکھیں کہ سچ اَمر ہے
قلم کا وجدان معتبر ہے "

میں کنجِ زنداں میں آچکا ہوں
مگر ابھی تک
مری نگاہوں کے سامنے ہیں
ندیم آنکھیں ' ندیم چہرہ

مظفر وارثی

احمد ندیم قاسمی

شاہِ ادب کہوں کہ امیرِ سخن کہوں
فن کار کیا کہوں اسے ، اک عہدِ فن کہوں

کھینچے حصار پیار کا ، غیروں کے گرد بھی
اُس کی نظر کو بے وطنوں کا وطن کہوں

احمد بھی ہے ، ندیم بھی ہے ، قاسمی بھی ہے
اس ایک ذات کو میں بھری انجمن کہوں

گمبھیر شب کا آخری تارہ کہوں اُسے
یا پھول پر پڑی ہوئی پہلی کرن کہوں

کاٹے دُکھوں کے سنگ وہ لفظوں کی دھار سے
ایسے قلم بکف کو مَیں شمشیر زن کہوں

توڑے وہ اپنی پیاس سے دریاؤں کا غرور
طبعِ رواں کو اُس کی ، تلاطم شکن کہوں

اُس کی ہر ایک سانس مظفّر ہے اک چراغ
وہ ایک پھول ہے مگر اس کو چمن کہوں

رضی اختر شوق

حرف کی فصیل

کیا عجب آدمی ہے !
اس کو اپنے محاذوں پہ لڑتے ہوئے
کوئی ستّر برس ہو چکے ہیں
اِتنے برسوں میں کتنی فصیلیں
قلعے
ڈھ گئے
کتنے سر شب کی دھلیز پر جھک گئے
کتنے قلم رک گئے
کتنے الفاظ
احساس کی کوکھ میں مر گئے

اور وہ اپنے ہر مورچے پر
اسی شان اور دبدبے سے کھڑا ہے

کیا عجب آدمی ہے !
کیسے آہن نے
قامت تراشا ہے اس کا
اتنے ناوک
ترازو ہیں سینے میں اس کے
کہ ہر قطرۂ خون
اک کربلا ہے
پھر بھی ہر گھاؤ سے
گیت لکھتا ہوا
ارضِ یونان کے
سرکشوں کی طرح
اپنے ہر زخم سے سانس لیتا ہوا
چل رہا ہے !

●

خاطر غزنوی

درویشِ باصفا

وہ کوزہ گر ہے نہ آئینہ ساز ہے، لیکن
گِلِ حروف کی کوزہ گری میں رنگ اس سے
اسی کے فن سے جِلا آنسوؤں نے پائی ہے

وہ آئینے

کہ نظر آئیں جن میں روح کے زخم
بدن کے داغ
جنھیں حسن کا نشاں سمجھوں
مرے ضمیر کی لاشیں
مرے گناہ کا زنگ
مری ہوس کا بہیمانہ رقص
پیاس کے رنگ

وہ اس کا دل کہ عبادت گہِ ملائک ہے
نظر ورائے نظر جلوہ ہائے پنہاں پر
وہ اس کی فکر کہ خورشید کا سفر تھک جائے

سخن کی دنیا کا درویشِ باصفا
جس نے
کیا قلمروِ قرطاس پر رواں سکّہ
جہانِ سفلہ کے ہر آدمی کی عظمت کا
ہزار بار ہوئیں انگلیاں فگار اس کی
ہزار بار قلم ہاتھ اس کے ہو کے رہے
اسی کے خونِ جگر نے بصیرتیں بخشیں
اسی کے خون سے تابندہ فنِ شعر ہوا
بہ فیضِ فکر و نظر، تنگنائے نوکِ قلم
لیے ہے قلزمِ انوار اپنے سینے میں
اسی کے عزمِ جواں کے سبک سفینے میں
نئی رُتوں کے مسافر
عَلَم اٹھائے ہوئے
اتر گئے اس پار!

حفیظ تائب

ندیم

محبتوں کا امیں بھی ہے اور قسیم بھی ہے
گرہ کُشا وہ بہ پیرایۂ نسیم بھی ہے

رُواں رُواں مرا اس کو دعائیں دیتا ہے
وہ میرا راہ نما بھی، مرا ندیم بھی ہے

وہ عہد گر جسے ہر قدرِ نَو سلامی دے
ہر اک قبیلۂ اظہار کا زعیم بھی ہے

وہ باخبر ہے کلاسک کی سب روایتوں سے
نئے ادب کا نمائندۂ عظیم بھی ہے

ہے آج کون صداقت نگار اُس جیسا
وہ خوش مزاج بھی، خوش فکر بھی، حکیم بھی ہے

محسن احسان

ایک بڑا انسان

وہ تو اک گہرا سمندر ہے کہ جس کی تہہ میں
درد کی لہر بھی ہے ، شوق کا طوفان بھی ہے

اس کے سینے پہ سفینے ہیں کئی رقص کناں
جن کی ساحل پہ رسائی کا نگہبان بھی ہے

اس کی اک ذات میں ہیں قوسِ قزح کے کئی رنگ
جن کو پہچاننا مشکل بھی ہے ، آسان بھی ہے

اس کے زخموں میں ہے آفاق کے زخموں کی نمود
وہ جہاں دار بھی ہے ، بے سرو سامان بھی ہے

اُفقِ فنِ صداقت پہ چمکنے والا
اک قلم کار نہیں ، اک بڑا انسان بھی ہے

وہ تو ہے حسنِ اخوت کا وہ تاریخ نگار
جس نے آزادیِ افکار کی تفسیر لکھی

جس نے جمہور کے آئینوں کے ریزے چُن کر
اُن کے مٹی میں ملے خوابوں کی تعبیر لکھی

جس نے گرتی ہوئی دیوار کو کاندھا دے کر
شہرِ تخریب میں رعنائیِ تعمیر لکھی

سرخیِ چہرۂ انساں نکھر آئی جس سے
نوکِ مژگاں سے سرِعرش وہ تحریر لکھی

جس کے ہر لفظ میں ہے نورِ جہاں کا پَرتو
جس نے ہر بات بانداز جہاں گیر لکھی

گلزار

بابا کے لیے

اک گھنا پیڑ ہے وہ ' جس کی گھنی چھاؤں میں
دھوپ اُترتی ہے تو اتنی سی زمیں پر جیسے
سینکڑوں لفظوں کے سکّے سے بکھر جاتے ہیں
گول ' چوکور ' چمک دار ' طلائی سکّے
جانے کیا لکھتی ہے چھاؤں میں پڑی دھوپ وہاں

میں بھی اُس پیڑ کی چھاؤں میں گیا ہوں برسوں
اور بھر لیتا تھا اُن سکّوں سے جیبیں اپنی
اور تنہائی کو پہلو میں بٹھا کر اکثر
پہروں آہنگ سنا کرتا تھا ان سکّوں کا

اُن پہ ابھرے ہوئے چہروں کو پڑھا کرتا تھا
کوئی افسانہ سناتا تھا ' کوئی نظم کبھی
ادب و شعر کے گلشن میں بہت ذکر سُنا
اس کی گھنی چھاؤں کا
اب بھی جیب جاتا ہوں میں اپنے سخی پیڑ کے پاس
تو وہ بھر دیتا ہے جُھب سے مری خالی جھولی
نئی نظموں ' نئی غزلوں ' نئے افسانوں سے
وہ سخی پیڑ مرا دوست ' مرا بابا ہے
وہ جسے لوگ بڑے پیار سے کہتے ہیں " ندیم "

سلیم کاشر

دو سورج

اِک سُورج رُشنائیاں ونڈے کالنج ڈنگیاں تائیں
نالے نویں حیاتی دیوے پالے بھنڈیاں تائیں
اُسدے پاروں فصلاں تے پھل پکدے نیں
ڈِھڈاں دے تُندوراں لئی جو بالن بن دے رہندے نیں
اُسدے کولوں چَن تے تارے چانن بھکھیا لیندے نیں
فیروی بن بن بہندے نیں

دُوجا سُورج دھرتی اُتے وَیروں ڈنگیاں روحاں تائیں
پیار دیاں کرناں دیندا اے
حوصلے ہارے پاہندھیاں تائیں نویاں ہمتاں دیندا اے
اُسدے پاروں شہرادب دے وسدے نیں

دِلاں دے سُنج مساناں اندر سرکدا رہندا چانن ایہدا
اُسدے کولوں لکھاں شعر دے نویں مسافر
منزل دی ٹوہ لیندے نیں
نہ تھکّن نہ اَکّن دے لئی مِٹھی خوشبو لیندے نہیں

پہلے سُورج چانن بھکھیا دیندیاں کدے وی تھکنا نہیں
دوجے سُورج مِٹھی خوشبو دان کریندیاں اَکنا نہیں
چانن تے خوشبو دے سفر نے مکنا نہیں
کسے وی جُوہ وچ رکنا نہیں
میرے لئی ایہہ فیصلہ کرنا ڈاہڈا مشکل ہویا اے
ایہناں دو نّواں سورجاں وچوں
کس دا دان اُچیرا اے
کس دے کول سویرا اے

اسرار زیدی

احمد ندیم قاسمی

ہزار طوفانِ برق و باراں
ہزار پتھریلی گھاٹیاں
اس کے راستے میں!
ہزار بل کھاتی ندیوں کا خروش
اُس کے سفر میں حائل!
زمیں پہ اب بھی قدم جمائے
صداقتوں کے علم اٹھائے

نُمودِ فن کی بشارتوں کو گلے لگائے
حیات کے پُل صراط پر
کتنی تمکنت سے رواں دواں ہے!

وہ اب بھی مشعل بدست
تاریک راستوں کے شکار میں ہے
طُلوعِ فردا کا استعارہ
وُہی تو ہے
اس سے روشنی
لے سکو تو لے لو!

●

اسرار زیدی

(ا) اُس کا اک رُوپ نہیں پیکرِ صد رنگ ہے وہ
(ح) حرفِ اِدراک میں ڈھلتے ہوئے سرگم اُس کے
(م) مُنجمد شعلوں میں بہتی ہوئی رعنائی کا عکس
(د) دشت و در اُس کے ، بدلتے ہوئے موسم اُس کے
(ن) "نہ ستائش کی تمنّا ، نہ صِلے کی پروا"
(د) درد یوں بانٹتا ہے جیسے سبھی غم اُس کے

(ی) یوں تو ہونے کو ہوَا ایک زمانہ اُس کا
(م) مصلحت کیش بھی کہتے ہیں کہ ہیں ہم اُس کے
(ق) قلم اُس کا کہ گرہیں کھول رہا ہے فن کی
(ا) اَن گنت ہاتھ اُڑاتے ہوئے پرچم اُس کے
(س) ساٹھ سال عمر کے ایک جہدِ مسلسل کی خبر
(م) مگر اِس پر وہی تیور، وہی دم خم اُس کے !
(ی) یا خود افسانہ ہے یا شعر کا آہنگ ہے وہ !
اس کا اک روپ نہیں پیکرِ صد رنگ ہے وہ

سیّد نصیر شاہ

سچائی کی سالگرہ

پروردگارِ عشق ، اے پیغمبرِ جنوں !
اِس قتل گاہِ زیست میں زندہ ہے کس طرح

سقراط کے لبوں میں بھی دفنایا تھا تجھے
مصلوب تجھ کو صورتِ عیسیٰ کیا گیا

طائف میں سنگسار بھی ہوتا رہا بدن
اور کربلا کی دھوپ میں جھلسا دیا گیا

مَیں پوچھتا ہوں اشبِ دوراں کو روک کر
تاریخ کے مزار سے نکلا ہے کس طرح

سورج ہے تیری ذات' اُجالے ترے قدم
تو نے بکھیرا ہے وہاں صبحوں کا آبشار

لمحے جہاں گزرتے تھے پلکوں کی نوک پر
میرے ندیم ' مجھ کو اجازت ہے ؟ پوچھ لوں ؟

اس اجنبی دیار میں آیا ہے کس طرح
اس قتل گاہِ زیست میں زندہ ہے کس طرح

پروین فنا سید

فن کار

شب کی گھمبیر سیاہی میں اسے پایا ہے
دن کے بھر پور اجالے میں نظر آیا ہے

لہلہاتے ہوئے کھیتوں میں وہی وجہِ نمو
اور دھقاں کے پسینے میں اُسی کی خوشبو

کبھی برسات کی " رِم جِھم " میں اسے ڈھونڈا ہے
" شعلۂ گل " میں کبھی اس کا شرر چمکا ہے

مردِ مومن کی نگاہوں سے عیاں اس کا " جلال "
قلبِ شاعر پہ ہے انوار فشاں اس کا " جمال "

تو نے ہر حال میں اس نور کو پہچانا ہے
تیری دھڑکن نے اسے اپنا خدا مانا ہے

تو نے اُس نور سے ہر شعر کو چمکایا ہے
تیرے گیتوں میں وہی نور اتر آیا ہے

تیرے زخموں کے دیے " دشتِ وفا " میں چمکے
تیرے اشکوں کے گُہر شب کی رِدا پر دمکے

تیرگی پر تجھے ہر لمحہ اجالوں کا گماں
ظلمت و نور کا عرفان ! --- پھر ایسا عرفاں !

تیرے سینے میں دھڑکتا ہوا فن کار کا دل
جیسے طوفاں میں سفینے کو یقینِ ساحل

ایک دنیا سے نرالا ترا اندازِ جنوں
لب پہ ھلکا سا تبسّم ہے ' نگاہوں میں سکوں

تجھ کو بھائی کہوں ' ہمدم کہوں شاعر کہ ندیم
دیوتا فن کا ' کہ فن کار کا شہکارِ عظیم

●

خراجِ عقیدت بنام احمد ندیم قاسمی

خالد احمد

ندیم کے تعاقب میں ایک نظم

آنکھ جھپکی نہ ایک پل کے لئے
رُو برُو اَن گِنت اجالے تھے
کس ہُنر کا سفر تھا کل کے لئے
کس نے یہ راستے نکالے تھے
کس کے پیروں میں کس کے چھالے تھے
دشت بولے، اگر زبان ملے
کس نے کتنے علم اچھالے تھے
کوئی دم لے تو کچھ نشان ملے
گرد بیٹھے تو آسمان ملے
ہر طرف گرد کے تماشے تھے
فاصلے فاصلوں سے آن ملے
کچھ عجب راستے تراشے ہیں
جہتِ فن تری، بیان ترا
ہم کو خود پر بھی ہے گمان ترا

خالد احمد

ندیم کے لئے ایک ترائیلے

کوئی فن، کوئی پیرایہ، ترے شایاں نہیں پایا
تجھے میں نے چھُوا لیکن، بہت محتاط نظروں سے
تری سج دھج نے میرے بے ہنر جذبوں کو مہکایا
کوئی فن، کوئی پیرایہ، ترے شایاں نہیں پایا
پسِ الفاظ، دل رکھ کر، ترے عکسوں کو دہرایا
تجھے میں نے گذارا اَن گِنت آئینہ خانوں سے
کوئی فن، کوئی پیرایہ، ترے شایاں نہیں پایا
تجھے میں نے چھُوا، لیکن، بہت محتاط نظروں سے

خالد احمد

ندیم

تیری بلندیوں سے سَو آبشار نکلے
سب کم کنار آئے ' سب بے کنار نکلے

تیرے حریمِ فن سے ' سچّائی کے گگن سے
تارے پہن پہن کر ' ہالوں کے ہار نکلے

تُو عصر کا جھکاؤ ' تُو زیست کا سبھاؤ
تیرے سخن سخن سے لہجے ہزار نکلے

تیری نظر سے تیرے پھوٹیں نئے سویرے
پت جھڑ کے پربتوں سے رُودِ بہار نکلے

ہر سُر میں رنگ تیرے' ہر لَے میں ڈھنگ تیرے
سپتک کوئی بھی چھیڑیں ' تیری پکار نکلے

افکار کی لپک بھی ' اظہار کی گمک بھی
میرے قلم پہ تیرے کیا کیا ادھار نکلے

خالدؔ[1] ' نجیبؔ ' گوہرؔ ' تائبؔ ' قتیلؔ ' جعفرؔ
سب کم کنار آئے ' سب بے کنار نکلے

۱۔ خالد احمد ' نجیب احمد ' گوہر ہوشیار پوری ' حفیظ تائب ' قتیل شفائی ' جعفر طاہر

امجد اسلام امجد

احمد ندیم قاسمی

مَیں نے اُس شخص کی آنکھوں میں فروزاں دیکھی
اُس کے نکھرے ہوئے باطن کی چمک
اُس کی تحریر کی خوشبو میں گل افشاں دیکھی
اُس کے مہکے ہوئے لہجے کی کھنک
اُس کے کردار کے پردے میں نمایاں دیکھی
عظمتِ آدمِ خاکی کی جھلک !
اُس نے بتلایا مجھے
کیسے فن کار کا فن
اُس کے احساس کی قوت سے جنم لیتا ہے
اُس نے سکھلایا مجھے
کس طرح کوئی زمانے کو مسرت دے کر
اپنے حصّے میں الم لیتا ہے
آسماں کون سے لوگوں کے قدم لیتا ہے !!

نجیب احمد

ندیم

وہ دن کسی شب طلوع ہوگا
یہ رات اک دن غروب ہوگی
سحر کی فرغل ' دراز دامن کی طرح کُھل کر
ترے وطن کا سیاہ سینہ سمیٹ لے گی
گلی گلی کو بدن سمجھ کر لپیٹ لے گی
ہوا کے ہاتھوں میں تیرے پرچم کا ہاتھ ہوگا

سکوں کی دلہن ترے سہارے دھنک کی ڈولی سے تیرے سائے میں
سر جھکائے

اداس کُٹیا میں آ بسے گی
وہیں رہے گی ' وہیں ہنسے گی ' وہیں بسے گی

ندیم ! ہم تو ترے نقوشِ قدم پہ چل کر
ترے تصوّر کے ساحلوں پر اتر چکے ہیں
سنور چکے ہیں
مگر تو اس پل نئے سرے سے گلاب منزل کی جستجو میں
ہرے جزیروں کی آرزو میں ' نئے سفر پر نکل چکا ہے

ایوب خاور

احمد ندیم قاسمی کے لئے
ایک نظم

خدائے بحر و بر !
اس شرگزیدہ عہد کے نا مہرباں اور منحرف لوگوں کے
انبوہِ گراں میں کتنے ایسے لوگ ہیں ' جن کے قلم سے
روشنائی کی بجائے ان کے اپنے ہی جگر کا خوں ٹپکتا ہے
رگِ جاں سے نکل کر
کس کا حرفِ معتبر کاغذ کی سطحِ صاف پر ' ایقان کی
صورت اُترتا ہے
گُلِ صد رنگ کی مانند کِھلتا
اور مہکتا ہے

سبھی تو ایک گہری چپ کی بُکّل مار کر بیٹھے ہوئے ہیں
مُردہ لفظوں کی جُگالی کر رہے ہیں ' اپنے اپنے نام
کی تختی کو سینوں پر سجائے اُونگھتے ہیں ' اِن کی
آنکھیں خواب سے خالی ' دلوں کی دھڑکنیں خوشبو سے
عاری ' ہاتھ کی پوریں عداوت اور منافق زاد
سچّائی سے بوجھل ہیں
مگر اک شخص ان کے درمیاں
ایسا بھی ہے جس نے
ہمیشہ سچ لکھا ' سچّائی جیسا سچ لکھا
سچّائی اور انسانیت کے پرچم خوش رنگ پرنُورِ ہنر سے
زندگی اور زندگی کے مسئلے کاڑھے
کسی دورِ شہنشاہی میں اپنے سر کو سینے پر جھکایا
اور نہ ابنوہِ غلاماں میں کھڑے ہو کر خود اپنی خاک
پھانکی اور نہ اپنے ساتھیوں کی خاک اڑائی ہے
وہ خوشبو کی طرح پاکیزہ ہے
وہ خوش ہنر ہے' خوش نظر ہے اور وہ اہلِ ہنر'
اہلِ نظر کی اس طرح تکریم کرتا ہے کہ جیسے صبح ' بادِ صبح
کی تکریم کرتی ہے

خدائے بحر و بر! مجھ کو
اسی اک خوش ہنر اور خوش نظر سچّائی کے پیکر کے
قدموں میں جگہ دے دے !
میں اس کے پاؤں کی مٹی کو چُھونا چاہتا ہوں
اور اس کے ہاتھ کی پوروں میں اُتری سچ کی بوندوں سے
میں اپنی آنکھ کے برتن کو بھرنا چاہتا ہوں ' اس کے
لہجے میں دکھوں کی جو نمی ہے' وہ سفالِ دل میں
رکھنا چاہتا ہوں
اے خدائے بحر و بر ! اس
شخص کے خوابوں ' خیالوں اور آدرشوں کی خاطر اور
مستقبل کی ساری آرزوؤں کے لئے ' میں اپنی کشتِ جاں
کو وقف کر کے ایک احساسِ ترفّع سے دہکنا چاہتا
ہوں ---- اے خدائے بحر و بر ! مجھ کو ذرا اس
خوش ہنر اور خوش نظر سچّائی کے پیکر کے قدموں
میں جگہ دے دے !

صفدر سلیم سیال

جناب احمد ندیم قاسمی کی نذر

وہ چارہ گر بھی ہے ' دستِ ہنر بھی رکھتا ہے
خیالِ خاطرِ اہلِ نظر بھی رکھتا ہے

ستم بھی سہتا ہے اہلِ ستم کے ہاتھوں وہ
پہ ابتلا میں وہ ان کی خبر بھی رکھتا ہے

کسی مقام پہ کرتا نہیں غرُور ' مگر
عدُو کے سامنے سینہ سپر بھی رکھتا ہے

اشرف جاوید

اے مسیحائے فن

لفظ خاموش تھے
لفظ خاموش ہیں
اے مسیحائے فن!
تیرے اذنِ تکلّم کے کچھ منتظر
بے بصر آنکھ میں روشنی کی تمنا لیے
سطحِ قرطاس پر اپنے ہونے کا کوئی نشاں ڈھونڈتے
لفظ خاموش ہیں
لہجہ لہجہ رواں
لمحہ لمحہ دواں
حرف تا حرف اک فاصلہ
از قلم تا قلم سچّے جذبات کا ایک بحران ہے
قحطِ ابلاغ ہے
لفظ اک داغ ہے
کوئی مفہوم کے بطن میں کیسے اترے

کہ لفظوں کی اندھی فصیلوں کے اُس پار
سہمے ہوئے، بے جہت راستوں کے ادھورے صحیفے
بصارت کی شاخوں پہ کھلتے ہوئے پھول ڈسنے لگے
زہر نس نس اجالوں میں بسنے لگے
اے مسیحائے فن!
اس سے پہلے کہ اذہان کے بام پر فکر کے چاند
بجھنے لگیں
زخم کھلنے لگیں
ہونٹ سلنے لگیں
گنگ الفاظ کو اذنِ گویائی دے
شہرِ اشعار کو اپنی سچّائی دے
اجنبی رُت کو ——— لطفِ شناسائی دے
تیری چشمِ گل افروز کی خیر ہو
اپنے افکارِ تازہ کی خیرات دے
تاکہ ہم تیرے دستِ ہنر کے قلم کے لبوں سے
ٹپکتے ہوئے پھول چنتے رہیں
خواب بُنتے رہیں

●

ناہید قاسمی

"دشتِ وفا" کی پکار

میرے شاعر! میرے ندیم !!
جشنِ آزادی کی شب کو
تیری کتاب کا دیا اُٹھائے
میں ماضی کی دھندلی وادی میں جا اُتری ـــــ
ـــــ اور پھر چونک اٹھی .....
(آج سے پہلے یہ سب میں نے اتنا نمایاں کیوں نہیں دیکھا!)
..... ہر اک مصرع میرے وطن پر بیتے لمحوں کا سچا اظہار لئے تھا
سب الفاظ آئینے تھامے
آنے والے دنوں کی اک اک واضح جھلکی لے کر
بڑے سلیقے اور ترتیب سے میرے گرد قطاریں باندھے
آنے جانے لگے

سچائی کی یہ عکاسی دیکھ کے میں تو رو دی ------
(میرے وطن! اے میرے پیارے پاک وطن!
تو نے اتنے دکھ بھوگے اور ایک اکیلی جان پہ بھوگے!)
---- آنسو پونچھ کے میں نے دیکھا
سارے منظر دُھل سے گئے تھے
سب کچھ کتنا صاف اور کس درجہ شفاف دکھائی دینے لگا تھا
اک اک شعر کا اک اک غنچہ
کتنے سوالوں کے بس ایک جواب کی خاطر چٹک رہا تھا
میں بولوں تو کیا بولوں؟
جب، اے مرے شاعر! تو نے تو سب کچھ خود ہی کہہ رکھا ہے
لیکن شاید ہم لوگوں نے دل سے سننا، دل کی آنکھ سے دیکھنا چھوڑ دیا ہے
اب جانے کب، کون سبھی کو ساتھ لئے
تیرے خوابوں، تیرے شعروں کے خاکوں میں
رنگ اُبھارنے آئے
میری دعا ہے، میرے مالک! دیر نہ ہونے پائے

جاوید انور

اے شجر تیرے لئے

میں بھی لایا ہُوں گلاب
میں بھی آیا ہوں مہک میں لپٹا
اے شجر تیرے لئے
میں تری چھاؤں اُٹھا لایا ہوں
لے مرے پھُول بھی لے
سُن مری نظم بھی سُن
نظم جو تیری شفق میں لپٹی
نظم جو میرے افق سے پھُوٹی
اے شجر تیرے لئے
اے شجر
تیرے لئے !

آصف ثاقب

نذرِ ندیم

سر پہ گزری داستاں ، تلوار پر لکھتا رہا
آنے والے کل کے غم دیوار پر لکھتا رہا

سر بلندی مل گئی ہے اس کی ہر تحریر کو
عظمتِ انساں کے مضموں دار پر لکھتا رہا

کٹ گئی " انکار " کی تردید میں ساری حیات
وہ کہ غزلیں زیست کے " اقرار " پر لکھتا رہا

سنگ اٹکے تھے گلے میں، شعر، پر کہتا رہا
انگلیوں میں گڑ گئے تھے خار ، پر لکھتا رہا

عمر بھر جلتا رہا تھا دھوپ کی شدّت میں وہ
شعر لیکن سایۂ اشجار پر لکھتا رہا

یار کے ، اغیار کے آزار سہہ کر بھی ندیمؔ
پیکرِ اخلاص ! سچّے پیار پر لکھتا رہا

صابر ظفر

نذرِ ندیم

ترے وجود کو بیساکھیاں بنائے ہوئے
رواں دواں ہیں کئی لوگ سر اُٹھائے ہوئے

بہت ہی زُود فراموش ہے یہ عہد ، مگر
محیط دہر پہ ، تیرے سخن کے سائے ہُوئے

فرازِ فن پہ جو دیکھوں تو مَیں یہی سوچوں
بہت سے لوگ ہیں تیرے سبب سے آئے ہوئے

اس ایک بات نے تُجھ سے نہ دُور ہونے دیا
تو مہرباں رہا ، اپنے بھی جب پرائے ہوئے

مِرے ندیمؔ ! ظفرؔ معترف ہے اُن کا بھی
جو تُو نے زیست کے معیار ہیں بنائے ہوئے

عباس تابش

احمد ندیم قاسمی کے لئے ایک نظم

مِرے بادشہ ! تری خیر ہو
تری شہ نشیں کے جوار میں
مرے دست و لب پہ دعائیں ہیں
تجھے ربِّ حسن، حیات دے
ترے حرف تیری مثال ہوں
مِرے بادشہ ! تری خیر ہو
کبھی اِس طرف بھی نگاہ کر
ترے نطقِ تازہ کے روبرو مری خستگی کا غبار ہے
میں تہی قدم
میں تہی حشم
مرا مُو قلم ابھی رنگ جُو بھی ہُوا نہیں
مرے منہ میں دانۂ حرف دے
کہ درِ سخن پہ فقیر کی کوئی پیش چلتی نہیں ابھی

گلِ داد خواہ کے عہد میں مِرے چاکِ لب ہیں سِلے ہوئے
کوئی پھُول بھی مِرے آئینے میں کھلا نہیں
کوئی مجھ کو مجھ سا ملا نہیں

میں چراغِ خفتہ کی رات میں ترے خوانِ حرف تک آگیا
مجھے اپنے منہ کی جُھٹال دے
کہیں آشیانۂ ذات سے مِری طِفلگی نہ پھسل پڑے
مِرے منہ میں دانۂ حرف دے

ابھی صبح ہونے میں دیر ہے
اِسی خامشی کے حجاب میں مِری تیرگی کو نواز دے
مجھے رزقِ حرف کا راز دے
ترے ہاتھ کو بھی خبر نہ ہو، مرے ہاتھ کو بھی خبر نہ ہو
در و بابِ حرف و نوا کُھلے کہ سنہرے چاند کے طشت میں
کوئی خوشہ چینِ صدا ترا، تجھے پھُول دینے کو آیا ہے
بڑی دور سے
مرے بادشہ ! تری خیر ہو !

منصور آفاق

ندیم

علم و قلم کے شہرِ محمدؐ کا اک سخن
املوک کے درخت پہ نانک کا کوئی بھید
نروان کی تلاش میں بُدھ کا مراقبہ
تخلیق کے خدا کی مقدّس ترین وید

سقراط کے ضمیر میں اتری ہوئی نظر
شبیرؓ کے لہو میں دھڑکتا ہوا قلم
عیسیٰؑ کی ڈوبتی ہوئی مصلوب ساعتیں
منصور کی خدائی کا جلتا ہوا عَلَم

وہ کانٹ کے قدیم خیالوں کی بازگشت
ہیگل کے جدلیاتی تضادوں کا آبشار
ڈیکارٹ کے طلسم میں شک کا عظیم اسم
اقبال کے قلم کی کرامت کا راز دار

لینن کی بے مثال تگ و دَو کا سلسلہ
چیخوف کے دماغ کا افسانوی جمال
ملٹن کی خواب گشتہ بہشتوں کا مرثیہ
جبران کے اُلوہی تخیّل کے لاکھ سال

وہ بونواس، عمر و معرّی کا ایک روپ
قیس و خیام و حافظ و غالب کی آبرو
فکرِ فرید و وارث و باہو کا امتزاج
وہ میرے جوش و فیض کے سپنوں کی گفتگو

ہمراز ورڈز ورتھ کا، شیلے کا ہم نفس
ہر حرف میں ہیں کیٹس کے رومان مضطرب
فقرِ لطیف و غیرتِ خوشحال کی تڑپ
رومی و بایزید کا وجدانِ مضطرب

ٹیگور کے شعور کا پُرزور احتجاج
انجیل کے سروپ کا اک گم شدہ ورق
ماؤ کی بے قرار نظر کی اداس نظم
بھٹو کے گرم خون سے لتھڑی ہوئی شفق

حسن رضوی

دشمنوں کا ندیم

ہزاروں کاغذ مَیں پڑھ چکا تھا
ہر ایک کاغذ پہ جانے کیا کچھ لکھا ہوا تھا
میں کاغذوں میں تلاش کرتا رہا وہ دنیا
وہ دنیا جس میں کہ روشنی ہو
وہ دنیا جس میں کہ زندگی ہو
جو میرے باطن کی کالی راتوں کو جگمگاتی
جو میرے فن کے اَتھاہ سمندر میں اک کرن بن کے تیَر
جاتی
وہ میرے فن کو شعور دیتی
امید جگنو بکھیر دیتی

تلاش کرتا رہا میں اک ایسی پیاری دنیا
کہ جس میں بچوں کی مسکراہٹ کی ہر طرف چاندنی بچھی ہو

ہزاروں ماؤں کی لوریاں گنگنا رہی ہوں
جہاں محبت ہو، امن ہو، حسن ہو، سکوں ہو
مگر وہ دنیا
نہ جانے کس پردۂ خفا میں چھپی ہوئی تھی

تمام کاغذ تھے کورے کاغذ
ہر ایک کاغذ میں آدمیت کی سرخیوں کی بجائے
اندھی مصالحت برف کی سفیدی میں ڈھل گئی تھی

پھر ایک کاغذ مجھے ملا جس پہ زندگی کا شعور لفظوں میں جلوہ گر تھا

لکھا تھا جس پر:
"ہر ایک انساں عزیز مجھ کو
ہر ایک دشمن رفیق میرا
وطن کی دھرتی کا پیڑ ہوں میں

خراجِ عقیدت بنام احمد ندیم قاسمی

کہ میرا سایہ سبھی کا سایہ، ہر ایک پر ہے
مرے عدو بھی جو چاہیں آئیں
اور آ کے اِس پیڑ کی گھنی چھاؤں میں نہائیں
وہ میرے شعروں سے روشنی لیں
مرے فسانوں سے تازگی اور زندگی لیں
جو مجھ کو دشمن سمجھ رہے ہیں
مَیں اُن کا بھی تو نہیں ہوں دشمن
جو دشمنی ہے تو مجھ کو اُن سے
جنہوں نے ہم سے ہماری سوچیں ہی چھین لی ہیں
جنہوں نے ہم سے ہمارے جینے کا حق بھی چھینا
ہمارا دشمن تو وہ ہے
جو میرے بھائیوں کے گلاب چہروں کا خون پی کر جواں ہوا ہے

ہمارے گھر کو جلا رہا ہے
اور اس کا گھر جگمگا رہا ہے
ہمارا دشمن، تمہارا دشمن، وہ سب کا دشمن
جو اس کو پہچان لو تو جینا مرا سپھل ہو ---- !"

وہ ایک کاغذ
لکھا تھا جس پر حقیقتوں کا کھرا فسانہ
وہ جس نے مجھ کو شعور بخشا ہے زندگی کا
وہ ایک کاغذ کہ جس نے میری سیاہ راتوں کو جگمگایا
محبتوں کا دیا جلایا

وہ ایک کاغذ
جو زندگی ہے اداس گھر کی
وہ ایک کاغذ
جو روشنی ہے مرے سفر کی
وہ ایک کاغذ، وہ اک غزل، ایک نظم، اک دلربا فسانہ
ندیمؔ کا تھا!

شاعر: جی بھینگ

ترجمہ: چانگ شی شوان (انتخاب عالم)

احمد ندیم قاسمی کے نام

راستے بھر
تیرا خاکہ سامنے رکھ کر
میں تیرے عزم و شفقت کی بناتا ہی رہا تصویر
دل کے کینوس پر
اور دہراتا رہا اشعار تیرے
اِس طرح جیسے کہ گنتا ہوں چمکتے دُرّ و زیور
روزِ فردا کے گجر کے قُفل کی کُنجی ہے تیری شاعری
پت جھڑ میں جلتی آتشِ گُل ہے تیرا ہر شعر
تو جس جنگ کو شیطان کہتا ہے
مچاتی ہے وہ اب بھی آفتیں تیری پڑوسی سرزمینوں پر

مرا جی چاہتا ہے تیرے اس شعر و سخن کے ملک میں
اپنے زمانے کی صدائے نو بلند کرنے کے فن پر
میں ترا اک درس بھی سن لوں
ہمہ تن گوش ہو کر
آگیا آخر یہ دن اس فصلِ گل میں
اس زمانے کی صدائے نو بلند کرنے کے فن پر
ایک ہی پل، ایک ہی بستی میں ہم تم تھے
مگر تاریخ راضی ہی نہ تھی ہم کو ملانے پر
زباں دیتی نہیں تھی ساتھ میرا
وقت نے بھی کچھ کیا تھا جبر مجھ پر
تیرے اس زندہ وطن کا یہ سفر
میرے لیے اک فخر کا سامان تھا
تیرے اک اک ہم وطن کو پیار کرنا
تیرے ہر اک کوہ و دریا سے گلے ملنا
تیری دھرتی کی مُٹھی مُٹھی مٹّی چومنا
کس درجہ چاہا تھا
جنہوں نے تجھ کو پالا
خوبصورت سرزمیں کا تو ہمیشہ ہے ثنا خواں
تو ہمیشہ ہے کسانوں، ناخداؤں اور چرواہوں کی تقدیروں پہ گریاں

تیری نظروں میں ' فقط محنت نئی دنیا کا گہوارہ ہے
اور ہر جارحانہ جنگ ہے انساں کی دشمن
شاعری میں نام جو پیدا کیا تو نے
تُو اس کے نشے میں مخمور ہی ہوتا نہیں ہے
شعر کہنے کا یہ سنجیدہ رویہ
آدمی بننے کا یہ معیارِ اعلیٰ
میرے دل پر زندگی بھر نقش ہوگا
آج میں نے اپنے اِس خط میں
سموئی ہے عقیدت اور حسرت اپنی
کب سے تک رہا ہوں راہ تیری
چین کا ایک بار پھر دورہ تو کر
آ ' شاعری کا یہ بھی ہے مشہور گھر
دیوارِ چیں کی سیر کر
پھر یانگسی کو پار کر
میں ساتھ دوں گا چپّے چپّے پر ترا!